# جدیدیت' تجدید اور اسلام

ڈاکٹر انیس احمد ○

یورپ میں' جس نشاتِ ثانیہ (renaissance) اور تشکیل جدید (reformation) کی تحریک کا آغاز چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں اٹلی سے ہوا' بہت جلد اس کے اثرات یورپ کے دیگر ممالک میں پھیل گئے۔

جس طرح اطالیہ (Italy) میں یونان کے قدیم علوم کی حیات ثانی (rebirth) کی تحریک چلی' ایسے ہی فرانس' جرمنی وغیرہ میں کلاسیکی ادب' فن تعمیر' موسیقی اور علوم کے احیا کی تحریک' احترام آدمیت (humanism) کی معصوم اصطلاح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اسی ردعمل کی بازگشت جرمن عیسائی مفکر مارٹن لوتھر کے معاصر اراسمس (Erasmus) کی تحریروں میں رونما ہوئی اور بہت جلد تقلید پسند عیسائیت کی گرفت معاشرے کے ذی شعور اور صاحب فکر افراد پر ڈھیلی پڑنی شروع ہوگئی۔ ارسطو' افلاطون اور دیگر فلاسفہ اور متکلمین کی فکر پاپاے روم کے مقابلے میں زبان زدعام ہونے لگی۔ یونانی فکر کی یہ حیات ثانی زندگی کے ہر شعبے پر اثرانداز ہوئی۔ نتیجتاً جدید یورپی انسان نے اپنے تصور' اخلاق' معاشرت' معیشت و قانون' ہر شعبہ حیات سے مقلدانہ عیسائیت کو خارج کر کے ایک لادینی طرز فکر کو اختیار کرنا شروع کیا۔

## ۱

سولھویں صدی میں مسلم دنیا سے روابط اور تبادلہ فکر کے نتیجے میں یورپ میں ایک علمی و فکری انقلاب کا آغاز تو ہو چکا تھا۔ تجرباتی علوم اور علوم عقلیہ کی ترقی پذیری کے ساتھ جامد مذہبیت زوال کی طرف جانا شروع ہوئی۔ اس عرصے میں طبیعیاتی' حیاتیاتی اور کیمیاوی علوم میں دریافتوں نے' مذہب کے

○ پروفیسر' بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی' اسلام آباد

مقابلے میں ایک لادینی (سیکولر) رجحان کو پروان چڑھانے میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بہت جلد وہ کلیسا جو کل تک ہر معاملے میں حرف آخر تھا' اب اپنی چار دیواری میں بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ کارزار حیات سے اس کا اثر برق رفتاری کے ساتھ کم ہونا شروع ہو گیا اور ''انسان دوستی'' (humanism) کے نام پر مذہب سے عاری ایک لادینی طرز فکر میدان حیات میں فتح مندی کے جذبے کے ساتھ آگے بڑھنا شروع ہوا۔ اسی دور میں یورپ کی عسکری اور سیاسی قوت میں اضافہ ہوا اور اس کی مقابل دوسری قومی و مذہبی قوتوں کے اضمحلال' سیاسی طوائف الملوکی' اخلاقی زوال اور معاشی طور پر دوسروں پر انحصار کا نتیجہ یہ نکلا کہ لادینیت پرست یورپی استعماری قوتوں کو دنیا کے ایک وسیع و عریض خطے' خصوصاً مسلم ممالک پر اپنا تسلط قائم کرنے کا موقع ملا۔

اپنی زبوں حالی اور یورپی سامراج کی چمک دمک سے متاثر ہو کر بہت سے اہل علم نے یہ عاجلانہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''ترقی اور لادینیت میں ایک منطقی ربط ہے''۔ چنانچہ جس طرح مغرب نے بظاہر یونانی فکر کی حیات ثانی کے ذریعے مقام ترقی حاصل کیا تھا' ان مفکرین نے بھی دین اسلام کو' عیسائی تقلید پسند مذہبیت کے مساوی قرار دیتے ہوئے اور بقیہ کاروبار حیات کو دنیاوی عمل قرار دیتے ہوئے' انسانی عقل کو اپنے لیے خود ضابطہ تجویز کرنے کا حق دے دیا۔ گویا سیاست' معیشت' تعلیم' قانون اور معاشرت کو دنیاوی سرگرمی قرار دیتے ہوئے ''روحانی'' اور ''مذہبی'' پابندیوں سے آزاد سمجھ لیا گیا۔ انھوں نے یہ اصول تسلیم کر لیا کہ دنیاوی معاملات میں دنیا والوں کے انداز اختیار کیے جائیں اور اگر ضرورت ہو تو نکاح' طلاق اور وراثت جیسے ذاتی معاملات میں جہاں تک ہو سکے مذہبی ضابطوں پر عمل کیا جائے۔

مغرب نے مذہب سے اپنی آزادی کی تحریک کو ''جدیدیت'' (modernism) کا نام دیا اور بظاہر تجدید و تجدد میں کوئی بنیادی فرق نہ کیا۔ تجدد کے زیرعنوان عیسائیت کے تصور خدا پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے' الوہیت کے دائرہ کار کو کلیسا میں محدود کیا۔ اس کے بعد نہ صرف ادب' فلسفہ اور فنون میں مشرکانہ اور اصنام پرست یونانی طرز فکر کو رائج کیا' بلکہ عملاً عیسائیت کے بطور ایک مذہب بساط لپیٹنے کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ عصر حاضر کی اس نئی بساط کے لیے کچھ نئے قواعد و ضوابط کا تعین بطور ایک متبادل نظام کے بھی کر دیا گیا۔

اب ایک نئی دنیا' اور نئے دور کے وجود میں آنے کے ساتھ اخلاق' قانون' معاشرت' معیشت' ثقافت اور سیاست میں انسان کی اپنی رائے' اس کا اپنا فیصلہ' اس کی اپنی عقل حرف آخر قرار پائی۔ نظام کلیسا کی پاپائیت (برہمنیت) کی مرکزی قیادت کے اختیار کے ساتھ عیسائیت کے الوہی نظام کو بھی معلق و معطل بلکہ برخواست کر دیا گیا۔

نئے بازی گروں نے اس نئے دور میں' سائنسی ترقی' عقل پرستی' انفرادیت پرستی اور مادہ کی بالادستی کو

جزو ایمان قرار دیتے ہوئے، کلیسا کی حکومت (theocracy) کی جگہ لادینی جمہوریت (سیکولر ڈیموکریسی) کو دور جدید کے مثالی نظام کے طور پر پیش کیا۔ ترقی اور عقلی رویے کو صرف اور صرف لادینی جمہوریت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا اور ایک نئی معاشی دنیا کی تعمیر کی بنیاد رکھی گئی۔

مسلمان دانش وروں کے ایک طبقے نے اپنی فکری اور ثقافتی پسماندگی و زبوں حالی کے پیش نظر، اس چڑھتے ہوئے مغربی سورج کے سامنے اپنے فکری احساس کمتری کی بنا پر، خود آگے بڑھ کر نیک خواہش اور تمنا کے ساتھ فکری غلامی کے مغربی کنگن اپنے ہاتھوں میں پہن کر اپنی شخصیت کی تکمیل کرنا چاہی، جب کہ ایک دوسرے طبقے نے تحفظ ذات کے لیے لادینیت کے اس سیاہ بادل اور اس کی گرج چمک سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کر کے خود کو ماحول و معاشرہ سے غیر متعلق کرنے اور ماضی کی روایات کو سینے سے لگانے اور دانتوں سے پکڑ لینے کو اپنا کمال سمجھا۔

اسلامی تہذیب و تمدن کا یہ ایک قابل غور پہلو ہے کہ جب بھی وہ فکری، اخلاقی، سیاسی اور معاشی زوال کا شکار ہوئی ہے، خود اس کے اندر ایک ایسی تحریک ابھری جو اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کا سبب بن سکے۔ عصر حاضر میں مغرب کے لادینی تسلط و تصورات نے اسلامی تہذیب کی اس صلاحیت کو پھر موقع فراہم کیا۔ ہمیں یہ کہنے میں قطعاً کوئی تردد نہیں کہ اسلامی احیا کی کیفیت کے پیش نظر بیسویں صدی کے لیے اگر کوئی نمایندہ عنوان تجویز کیا جا سکتا ہے، تو وہ صرف تحریکات احیاے اسلام کی صدی ہے۔

یہ احیاے اسلام جہاں امت مسلمہ کے لیے خود اعتمادی کے حصول اور احساس کمتری سے نجات کا سبب بنا، وہیں مغربی مفکرین کے لیے یہ احیائی تحریکات فکری تشویش بلکہ گہرے فکری مغالطے کا سبب بن گئیں۔ مغربی تجزیہ نگاروں کو مسلسل یہ فکر لاحق رہنے لگی کہ:

○ تجدید و احیاے دین کی اصلاحی تحریکات اگر کامیاب ہو گئیں تو ان کی نئی دنیا کی شکل کیا ہو گی؟

○ کیا اسلامی تحریکات کا تصور دین اسلام، قرآن و سنت کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کرے گا جو یورپ نے عہدنامہ قدیم اور عہدنامہ جدید کے ساتھ اختیار کیا؟

○ کیا احیاے دین کے نتیجے میں فقہا اور علما، زمام کار سنبھال کر تمام سائنسی تحقیقات کو بیک جنبش قلم معطل کر دیں گے اور پھر اندھی تقلید کا دور شروع ہو جائے گا؟

○ کیا اسلام کی دوبارہ میدان عمل میں آمد مذہبی اور صلیبی جنگوں کا پیش خیمہ ثابت ہو گی؟

○ کیا آزادی فکر اور حریت عمل کو باقی رکھا جائے گا؟

○ جدیدیت اور تجدید کے زیر اثر اسلام کی کون سی تعبیر پر عمل کیا جائے گا؟

○ وہ اسلام جو خانقاہوں اور دینی مدارس میں پایا جاتا ہے یا وہ جو مغربی تعلیم زدہ دانش ور پیش کرتے

ہیں، ان میں سے کون سا اسلام مطلوبہ اسلامی ریاست میں نافذ کیا جائے گا؟

○ خواتین اور غیر مسلموں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جائے گا؟ کیا انھیں انسان تسلیم کیا جائے گا؟ کیا اسلامی حکومت میں خواتین پر لازمی حجاب اور مردوں پر لازمی داڑھی کی پابندی ہو گی؟

○ کیا ٹیلی ویژن پر صرف درس قرآن، درس حدیث، نعت رسولؐ اور چند دنوں کے لیے مرثیے بھی پڑھے جائیں گے اور فنون لطیفہ کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے گا؟

○ دین کی مختلف تعبیرات جن کی گنجایش خود قرآن و سنت میں موجود ہو، ان میں سے کس کو درست مانا جائے گا؟

○ مذہب کے نام پر دہشت گردی، انتہاپسندی اور تشدد کا کیا مقام ہوگا؟

یہ وہ چند سوالات ہیں جو مغرب کے فکری مغالطہ اور تشویش کا ایک ہلکا سا عکس تجدد اور تجدید کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

ان میں سے کسی بھی مغالطے کا جواب اثبات یا نفی میں دینا نہ مسئلے کا حل ہوگا، اور نہ کسی فکری گرہ کے کھولنے میں مددگار ہوگا۔ شاید ان مسائل پر غور کرنے کا آغاز خود اہل اسلام کے ہاں زیادہ مناسب ہو۔ یہی چیز تجدد اور تجدید کا سوال حل کرے گی، اور عمومی سطح پر مذکورہ سوالوں کا جواب عطا کرے گی۔

**۲**

تغیر اور تبدیلی ایک ایسا فطری عمل ہے، جسے بطور ایک خبر کے اور بطور عبرت کے بھی، خود قرآن کریم نے اپنی تعلیمات میں جابجا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ اقوام عالم کے عروج و زوال، قیادت پر فائز یا معزول کیے جانے کو قرآن کریم میں آفاقی اخلاقی ضابطے کے طور پر بیان کیا گیا ہے:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ج (اٰل عمرٰن ۳:۱۴۰) یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔

قرآن کریم کے اس آفاقی اخلاقی ضابطے میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی تائید و نصرت کے ساتھ تبدیلی و تغیر کے لیے انسانوں کے اپنے طرز عمل اور اکتساب کو بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ انسانی تاریخ میں تبدیلی اسی وقت واقع ہوتی ہے، جب افراد میں حرکت پیدا ہو اور وہ اپنے نفوس، افکار و اعمال میں تبدیلی کے ذریعے قومی اور عالمی سطح پر قیادت کا کردار ادا کرنا چاہیں۔ اس اصول کو مزید وضاحت کے ساتھ ایک اور مقام پر یوں بیان فرمایا گیا ہے:

یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اس وقت

تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے (**الانفال ۸:۵۳**)

تغیر و تبدیلی کا قرآنی تصور انسان کو اس کی قوت ارادی اور صلاحیت عمل کی بنا پر زمان و مکان میں قوامیت کا مقام عطا کرتا ہے۔ گویا انسان' تاریخ کی پیداوار یا غلام نہیں ہے بلکہ خود تاریخ ساز ہے۔ اس کے برعکس مادی تعبیر تاریخ' انسانی معیشت' معاشرت' سیاست' ثقافت' حتیٰ کہ "مذہب" کو بھی مادی جدلیاتی عمل کے زیراثر ایک تاریخی عمل کی پیداوار (product) قرار دیتی ہے۔ منطقی طور پر تاریخ کی اس تعبیر میں انسان کا معاشرتی اور معاشی عمل' جسے کمتر سے بہتر کی طرف ایک سفر تصور کر لیا گیا ہے' یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہر نقش کہن کو خواہ وہ مذہب ہو' ثقافت ہو' اخلاق ہو' معیشت و معاشرت اور سیاست ہو' زمان و مکان میں تبدیلی و ترقی کے ساتھ منسوخ و معدوم ہو جانا چاہیے۔

اس تاریخی تناظر میں جب یورپ نے اپنے تاریک جاہلی دور سے مقابلتاً کم تاریک جاہلی دور میں قدم رکھا' تو نشاۃ ثانیہ اور تجدد کی تحریک نے ماضی کی تمام روایات بالخصوص عیسائی مذہب کو فرسودہ' ناقابل عمل' ماضی پرست اور غیر عقلی قرار دیا' اور جدید جاہلی انسان کو آزادی کا پیغام سناتے ہوئے رواداری و ترقی کے دور کے آغاز کا مژدہ سنایا۔ اس کے نتیجے میں مغربی مفکرین کے بقول اب ایک "لبرل انسانیت دوست" تہذیب کا دور شروع ہوا' جسے modern (جدید) قرار دے دیا گیا اور جدیدیت (modernism) کے زیرعنوان ماضی کی ہر روایت کو نشانہ جراحت بناتے ہوئے ہر شعبہ حیات میں "فرد کی آزادی" کو اپنا منشور قرار دیا' یعنی فرد جو چاہے' جس طرح چاہے اور جب چاہے' اپنے لیے ضابطہ حیات تجویز کرے۔

جدیدیت پر' جدید جاہلی تہذیب کے انسان کا یہ فخر و ناز زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکا۔ بیسویں صدی تک سفر کرتے کرتے اس پر یہ راز کھلا کہ جس چیز کو جدیدیت قرار دیا گیا تھا' وہ بھی اضافی ہی تھی' مستقل نہ تھی۔ اس لیے اب "جدیدیت سے اگلے قدم" (post-modernism) کے زیرعنوان ایک نئے سفر کے آغاز کی ضرورت محسوس کی گئی۔

دوسری جانب گذشتہ ۲۰۰ سال کے عرصے میں مسلم آبادیوں پر مغربی استعمار' ثقافتی یلغار اور خود مسلم آبادیوں کے فکری جمود کے نتیجے میں' مغرب کے لادینی تعلیمی نظریات اور طبقاتی نظام کے زیراثر ذہنی طور پر ایک محکوم نسل وجود میں آگئی۔ اس نسل نے مغربی اقدار حیات' معیار حق و باطل' ثقافتی رجحانات اور علمی روایت کو صحیفہ آسمانی سمجھتے ہوئے اپنے قلب و نظر کا حصہ بنا لیا۔ پھر مغربی تعبیر تاریخ کی روشنی میں اسلام کو بھی ساتویں صدی میں منظرعام پر آنے والا ایک "مذہب" تصور کرتے ہوئے معاشرتی' سیاسی اور معاشی و قانونی معاملات کے حوالے سے یہ سوال اٹھایا: وہ رسوم و رواج جو ماضی میں ایک "بدویانہ" ثقافت کی

پیداوار تھے، آج کیوں اختیار کیے جائیں؟ حجاب جیسی "دقیانوسی" روایت کو، جسے اسلام نے مردوں اور عورتوں کے لیے نہ صرف ضابطہ لباس بلکہ ضابطہ اخلاق قرار دیا، آج بھی اختیار کیا جائے گا؟ ایسا کرنا عالمی سطح پر رجعت پسندی ہوگا یا آزادی نسواں کی علامت قرار دیا جائے گا؟ سیاسی، قانونی اور معاشی دائرہ کار میں کیا خلافت کے قیام کے بغیر کوئی نظام اسلامی نہیں کہا جاسکے گا؟ کیا آج معاشی ترقی کے لیے، جس کی بنیاد سود ہے، اس کے برعکس قرآن کی معاشی تعلیمات پر عمل کیا جا سکے گا؟ کیا قرآن و سنت کے قوانین جو بظاہر ساتویں صدی میں منظر تاریخ میں آئے، تبدیلی زمانہ کے باوجود آج کے سنجیدہ معاشی و سیاسی حالات میں رائج کیے جاسکیں گے؟

ان سوالات کو اٹھانے والا ذہن چاہے مغرب کا مکمل ذہنی غلام اور سیاسی و معاشی تابع فرمان ہی کیوں نہ ہو، اور چاہے اس کا تصور تاریخ مطلقاً باطل اور محدودیت کا شکار ہی کیوں نہ ہو، اس کے باوجود ان سوالات کا اٹھایا جانا ایک قابل تحسین عمل ہے، بلکہ اقتضاے شریعت ہے۔ قرآن و حدیث کی اصل روح وہ حریت فکر ہے، جس میں ایک فرد اپنی ذہنی روایت کی غلامی سے نکل کر معروضی طور پر خود اپنے معتقدات، رسوم و رواج اور طرز عمل کا جائزہ لے کر دیکھے کہ وہ کہاں تک حق، عدل اور عقل کے تقاضوں سے عہدہ براء ہو رہا ہے۔ قرآن و حدیث نے ہر معاملے میں خواہ وہ عقیدے کا ہو، عائلی نوعیت کا ہو، فوج داری معاملات سے تعلق رکھتا ہو، غرض نوعیت مسئلہ کچھ بھی ہو، تعقل، تفکر، تدبر، تحقیق، تجزیہ و تحلیل کو اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اس لیے یہ سوالات بجائے خود اہمیت رکھتے ہیں۔ البتہ ان سوالات کے جوابات قرآن و سنت میں تلاش کرنے کے بجائے یہ مفروضہ اختیار کرنا کہ "اسلام کا عائلی نظام "فرسودہ" ہوگیا، اب اس کی جگہ برطانوی، فرانسیسی، ڈچ یا اطالوی قوانین نافذ کر کے جدیدیت کو اختیار کیا جائے" واضح طور پر غلامانہ ذہن و روح کا پتا دیتا ہے۔

مقام حیرت ہے کہ ایک سادہ اور چھوٹی سی بات جو مغرب زدہ افراد اور مغرب کے خاصے معقول ذہنوں میں نہ سما سکی، یہ ہے کہ دنیا کی تمام ثقافتوں، تہذیبوں اور "مذاہب" کو ایک محدود پیمانے پر جانچنا عقلی اعتبار سے اور نہ منطقی لحاظ سے موزوں عمل ہے۔ اگر بعض مذاہب میں تغیر و تبدیلی کے عمل کو پیش نظر نہیں رکھا گیا اور وہ جامد تقلید اور اندھی پیروی کا شکار ہوئے، تو ضروری نہیں کہ ہر نظریۂ حیات کے خمیر میں یہ خامی پائی جائے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جدید مسائل کے حل اور اسلام کے آفاقی و ابدی اصولوں کو نئے حالات میں نافذ و رائج کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی حیات مبارکہ میں ایک ایسا اصول تعلیم فرما دیا تھا، جو عبادات، معاملات، قانون و اقتصادیات غرض ہر شعبۂ حیات میں پیش آنے والے مستقبل کے مسائل کو جدید مطالبات کے پیش نظر حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس اصول کو

حدیث شریف میں "اجتہاد" کا نام دیا گیا ہے۔

اسلام کی فکری اور علمی تاریخ میں اجتہاد کا اصول کسی ایسے دور کی پیداوار نہیں ہے، جس میں اچانک عقلیت پرستی (rationalism) کے فروغ کی بنا پر چند علما و فلاسفہ نے اپنی دانش مندی اور دانش وری کے سہارے اس کا سراغ لگالیا ہو۔ نہیں، بلکہ اس کی تعلیم خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر مقرر کرتے وقت بیان فرمائی اور قیامت تک کے لیے اسلام میں تجدید اور جدید مسائل کے حل کی صلاحیت و حکمت عملی کو متعین فرما دیا۔

جب امت مسلمہ نے اس ابدی اصول کی حقیقت کو سمجھا اور استعمال کیا تو وہ طب، کیمیا، طبیعیات، انجینئرنگ، فقہ، فلسفہ، اخلاقیات، ادب، غرض ہر شعبہ علم میں وہ علمی انقلاب لائی جس پر آج تک انسانی تہذیب و ثقافت فخر کرتی ہے۔ لیکن جب اپنی تنگ نظری اور بالخصوص دین و دنیا میں تفریق کے لادینی بیرونی تصور کے زیر اثر اس نے اجتہاد کے دائرہ کار کو محض شخصی معاملات اور طہارت کے مسائل تک محدود کر لیا اور سیاسی، معاشی، علمی، سماجی اور قانونی معاملات میں وقت کے حاکم نظریات کی پیروی کو اپنا ذریعہ نجات سمجھا تو اجتہاد کا عمل خود بخود رک گیا۔

اجتہاد کی اسلامی روایت سے یہ انحراف ترقی و تجدید کے اس عمل کو، جو اسلام کی روح ہے اور جس کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن نے اجتہاد کے اصول کو مرکزی قرار دیا تھا، معطل کرنے کا باعث بنا۔ اس جمود و تعطل سے نجات کس طرح ہو؟ کیا اس کا حل مغربی فکر کو بنیاد بناتے ہوئے، اسلام کی تعلیمات میں سے ایک انتخاب کرنا ہے یا مسلمانوں کے ادوار ملوکیت و سلطانی میں اب سے سیکڑوں سال قبل تیار کیے گئے فتاویٰ اور قوانین کا اجرا و نفاذ کرنا ہے؟

ظاہر ہے کوئی شخص جو تھوڑی سی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہو، اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کے بعض سلاطین اور ملوک کے دور کے فتاویٰ کو، جدید حالات و مسائل کو نظرانداز کرتے ہوئے جوں کا توں "نفاذ شریعت" کے عنوان سے نافذ کر دیا جائے۔ مسئلہ کا اصل حل اجتہاد کے مسنون اصول کو اس کی مکمل شکل میں اختیار کرنا ہے۔ یعنی اجتہاد کو محض چند ذاتی مسائل تک مقید و محدود نہ کر دیا جائے، بلکہ وسیع تر دائرہ کار میں کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

اجتہاد کا کلی طور پر اختیار کرنا، وہ کلیدی فکر ہے جسے بیسویں صدی میں اسلامی تحریکات نے اپنی نظریاتی اساس قرار دیا۔ ان مسلمہ اسلامی تحریکات کی طرف سے تجدید و احیاے دین کی پکار ہو، ایک صالح جماعت کے قیام کی ضرورت کا احساس ہو، یا اقامت دین کی دعوت، عملی طور پر جائزہ لے کر دیکھا جائے تو ان سب کی بنیاد میں یہ خواہش ایک طاقت ور جذبے کے طور پر نظر آتی ہے، کہ رضاے الٰہی کو پانے کے لیے زندگی

کے تمام معاملات میں روح اجتہاد کو اختیار کرنا چاہیے۔

اس خواہش کے اظہار کے لیے اسلامی تحریکات نے جو لہجہ اور زبان اختیار کی' وہ اسلامی ثقافتی روایت کی روشنی میں قرآن و سنت سے مستعار اصطلاحات پر مبنی ہے۔ یعنی' حاکمیت الٰہیہ کا قیام' تزکیہ نفس' تعمیر سیرت و شخصیت اسلامی' اصلاح اُسرہ و معاشرہ' فکری تطہیر' تزکیہ مال و اقتصاد' قیام حکومت اسلامیہ' عدل اجتماعی' متوازن معاشی ترقی اور معاشرتی و سیاسی حقوق و فرائض کی ادائیگی۔ لیکن اس کے برعکس مغرب زدہ ذہن اور مغربی سامراج نے اس کا مطلب یہی لیا کہ اسلامی تحریکات آنکھیں بند کر کے ایک ایسا انقلاب لانا چاہتی ہیں جس میں "ماضی" کی اقدار مثلاً دور مغلیہ' دور مملوک یا دور سلاطین میں رائج قوانین و فتاویٰ کو جوں کا توں نافذ کیا جا سکے۔

ہمارے خیال میں اجتہادی اسلامی تحریکات کے حوالے سے یہ اتنی ہی بڑی غلط فہمی ہے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) جتنی مغرب کے بارے میں ہماری یہ غلط فہمی کہ مغرب میں پائی جانے والی ہر ہر فکر لازمی طور پر سرتاپا لادینیت' شرک اور عدم توازن کی علم بردار ہے۔ اس غلط فہمی کی اصلاح جتنی جلد ہو' اتنی ہی جانبین کے درمیان معقول و معتدل تبادلہ خیالات و رابطہ کے لیے مفید ہو گی۔ اس بات کی ضرورت شدت کے ساتھ ہے کہ کم از کم اسلامی تحریکات کے صحیح خدوخال خصوصاً جس پہلو کو ہم ان کا اجتہادی کردار کہتے ہیں' وضاحت سے پیش کیا جائے۔

## ۳

۲۰۰۰ء کی آمد کے موقع پر ایک مرتبہ پھر مستقبل میں اسلام کے کردار بالخصوص روایت اور جدیدیت کی بحث کو معاشی' سیاسی اور معاشرتی تناظر میں زیرِ گفتگو لایا جا رہا ہے' اور کہا جا رہا ہے کہ ایک عالم پیر مر رہا ہے' اور ایک جہان نو پیدا ہو رہا ہے' جس کی اصل پہچان اس کا معاشی تفوق اور نظریاتی طور پر ثنویت (dualism) کی فتح ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اس ثنویت میں معاشرہ اور مذہب دو ایسی قوتیں جو سابقہ دو صدیوں سے ایک بنیادی کردار ادا کر رہی تھیں' اب ان کی جگہ کچھ نئی اقدار کو لینا ہو گی:

> گذشتہ دو صدیوں سے مغرب اور ساری دنیا کی سیاست میں ریاست کے ذریعے انسان کے تمام مسائل کے حل کا تصور اہم ترین محرک رہا ہے۔ اس پر یقین اب ختم ہو چکا ہے۔ اس سے ایک خلا پیدا ہوا ہے۔ بنیاد پرست اسلام کا ظہور اس خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ یہ مغرب کے جمہوری فلاحی مملکت کے تصور اور کمیونزم کی خیالی جنت کے سحر ٹوٹنے کا نتیجہ ہے۔ امریکہ میں پروٹسٹنٹ اور pastroal گرجوں کا احیا درحقیقت کسی حد تک سیکولر ریاست کے ذریعے انسان

کے تمام مسائل کے حل کے تصور پر عدم یقین کا ردعمل ہے۔ ○

پیٹرڈرکر کے خیال میں مغربی اخلاقیات کے دو اہم بنیادی عناصر: مذہب اور معاشرہ اپنی تہذیبی عمر پوری کر چکے ہیں اور اب نئی صدی کے تناظر میں ایک نئے اخلاقی نظام نے اس خلا کو پُر کرنا ہے۔ مذہب خواہ وہ: عیسائیت ہو یا ہندوازم' یا بدھ ازم' اسے اپنے محدود روایتی کردار پر صبر کرنا ہوگا' کیونکہ ایک ایسے دور میں جہاں زمان و مکان کے تصور میں بنیادی تبدیلی آچکی ہے' اس کے لیے اجنبی بن کر رہ جانا اتنی غیر معمولی بات نہیں۔ خود یورپ میں مذہب کے کردار کو محدود کر دینے میں اس کی معاشرتی فکر (social thought) نے بھی بنیادی کردار ادا کیا اور وہ بہت سے کام جن کا تعلق روایتی مذہب سے تھا' اب معاشرے نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

چنانچہ ریاستی تعلیمی اداروں کے سرگرم عمل ہونے کے نتیجے میں ذاتی اور نفسیاتی معاملات' نکاح اور طلاق' عدالت اور تعلیم کے دائروں میں' روایتی مذہب کے بہت سے وظائف لادینی معاشرتی اداروں کے زیر تحویل آگئے۔ لادینی فلاحی ریاست کے تصور میں معاشرے کو وہ مقام حاصل ہوگیا جو کل تک مذہب کا حصہ تھا' اور اب یورپی انسان بڑی حد تک معاشرے کا بندہ بن گیا۔ معاشرے نے اسے ذاتی' سماجی اور معاشرتی معاملات میں لادینی' اخلاقی اور سماجی اقدار سے آراستہ کیا اور لادینی جمہوری سیاست کے ساتھ انفرادیت پسندی' اباحیت' لذتیت اور مادی ترقی و فلاح کو معاشرتی ترقی کی علامات قرار دیا۔

بیسویں صدی کے اختتام تک یہ اقدار یورپ و امریکہ کی ثقافت کی پہچان بن گئیں' لیکن بیسویں صدی کی سائنسی ترقیوں کے باوجود معاشرتی اور اخلاقی میدانوں میں جتنا واضح انحراف بلکہ زوال رونما ہوا' اس کی مثال خود جدید انسانی تاریخ میں بھی نظر نہیں آتی۔ بیسویں صدی کی سب سے مہلک اخلاقی بیماری "ایڈز" نے معاشرے کے بعض بنیادی تضادات سے پردہ اٹھا دیا' جو شخصی آزادی' انفرادیت اور اخلاقی اضافیت (ethical moral relation) ایسے خوش نما اصولوں کے نام پر ایک فرد کو اپنی من مانی کرنے کے لیے تحفظ فراہم کرتے رہے۔ اخلاقی اضافیت کی بنا پر سیاسی' معاشی اور معاشرتی معاملات میں عملاً ایک فرد کی اپنی خواہش اور حق و صداقت کی شخصی تعبیر زیادہ معتبر قرار پائی اور کسی مطلق سچائی' عدل اور حق کے تصور کو مکمل طور پر معاشرتی رواج کے تابع کر دیا گیا۔ فرد کے بنیادی حقوق اور شخصی آزادی کے نام پر اس اضافیت نے یورپ اور امریکہ میں سب سے زیادہ جس ادارے کو متاثر کیا' وہ مظلوم ادارہ خاندان کا ادارہ ہے۔

---

○ پیٹر ایف ڈرکر' "The New Realities in Government and Politics, in Business, Society and World"'
نیویارک' ۱۹۹۰ء' ص ۱۶

انسانیت کے تاریخی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ جب کبھی اور جہاں کہیں خاندان کا تقدس و احترام ختم کیا گیا، پھر اس معاشرے کو تباہی سے کوئی بڑی سے بڑی معاشی طاقت بھی نہ روک سکی اور ان معاشروں میں ویسی ہی مہلک بیماریاں پھیلیں جن کا ہم آج مشاہدہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ قوم لوط نے، جب بنیادی حقوق کے نام پر، آج کے gay rights (حق ہم جنسی) کی طرح اپنی بے راہ روی کو درست سمجھا، تو پھر قدرت حق نے دیگر اقوام کو ان کے مہلک زہر سے محفوظ رکھنے کے لیے انھیں مکمل طور پر تباہ کر کے نشانۂ عبرت بنا دیا۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر انسانیت کے مستقبل کے بارے میں یہ سوچنا ضروری ہے، کہ کیا فرد کی آزادی کے نام پر خاندان کے ادارے کو عملاً ختم کر کے اور اباحیت کو اختیار کر کے، مغربی تہذیب نئی صدی میں کوئی تعمیری کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ یا اس روبہ زوال تہذیب کی جگہ آفاقی، اخلاقی و الہامی اصولوں پر مبنی اسلامی تہذیب کو اس خلا کو پر کرنے کے لیے آگے بڑھنا ہو گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی تہذیب کو اپنی بقا و تحفظ کے لیے اسلامی تہذیب کے ساتھ ٹکراؤ کی جگہ باہمی تعاون اور مفاہمت پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

---

فہم قرآن میں اضافے کے لیے فنی کتاب "قواعد زبان قرآن" کا مطالعہ کیجیے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1 | قواعد زبان قرآن - دوسرا ایڈیشن | خلیل الرحمن چشتی | 250 روپے |
| 2 | درس قرآن کی تیاری کیسے کی جائے؟ | خلیل الرحمن چشتی | 15 روپے |
| 3 | حدیث کی اہمیت و ضرورت | خلیل الرحمن چشتی | 35 روپے |
| 4 | نصاب برائے حفظ | | 30 روپے |
| 5 | تزکیہ نفس | | 25 روپے |
| 6 | توحید اور شرک | محمد خان منہاس | 15 روپے |
| 7 | رسالت | محمد خان منہاس | 15 روپے |
| 8 | آخرت کا تصور | محمد خان منہاس | 15 روپے |
| 9 | نماز | محمد خان منہاس | 15 روپے |
| 10 | انفاق فی سبیل اللہ | | 15 روپے |
| 11 | موثر ابلاغ | محمد خان منہاس | 10 روپے |

گیارہ (11) کتابوں کے مکمل سیٹ کی قیمت مع ڈاک خرچ -/470 روپے ہے۔

کتابیں وی۔ پی نہیں کی جائیں گی۔ منی آرڈر یا ڈرافٹ کا پہلے آنا لازمی ہے۔

| | |
|---|---|
| الفوز اکیڈمی، اسلام آباد | 317, Street 16, F-10/2, Islamabad |
| Fax 051- 22 54 139 | Tel. 051- 22 51 933 |